بانی: حضرت اقدس مولانا شاہ سعید احمد رائے پوریؒ
قدس اللّٰہُ سِرّہُ السّعید مسند نشین رابع خانقاہِ عالیہ رحیمیہ رائے پور

شریعت، طریقت اور اجتماعیت پر مبنی دینی شعور کا نقیب

رحیمیہ لاہور

ماہنامہ

مدیر اعلیٰ: حضرت اقدس مولانا مفتی عبدالخالق آزاد رائے پوری
جانشین حضرت اقدس رائے پوری رابعؒ

مجلس ادارت
سرپرست: ڈاکٹر مفتی سعید الرحمٰن
صدر: مفتی عبدالمتین نعمانی
مدیر: محمد عباس شاد

دسمبر 2015ء / محرم، صفر 1437ھ

جلد نمبر 7، شمارہ نمبر 12- قیمت: 20 روپے

سالانہ ممبرشپ: 200 روپے - تین سالہ ممبرشپ: 500 روپے

فہرست مضامین

- تم بہترین اُمت ہو
- ظلم کا نتیجہ
- اِک معمہ ہے؛ سمجھنے کا نہ سمجھانے کا
- 2015ء کے متعین کردہ رُجحانات
- مجالس ؛ افاداتِ علم وحکمت
- دینی تعلیمات اور سوسائٹی کے اجتماعی امور
- دین اسلام ایک نظام اور سسٹم دیتا ہے
- علم وفکر پر اثر انداز ہونے والے عوامل
- تعلیم اور صحت کے بغیر خدمت ناممکن ہے
- ازدواجی زندگی میں عورت کی ذمہ داری
- حضرت نانوتویؒ کے بے مثال کمالِ علم کا سبب
- مخدومِ معظم محمد معین محدث ٹھٹھویؒ
- دورِ حاضر کی عبقری شخصیت، مجددِ عصر، داعی انقلاب
- ''امامِ انقلاب ثانی''
- دینی مسائل

ارشادِ گرامی حضرت اقدس مولانا شاہ عبدالقادر رائے پوری قدس سرہ

مسند نشین ثانی
خانقاہِ عالیہ رحیمیہ رائے پور

ایک خاص بات یہ بھی ارشاد فرمائی کہ:

''ایسا دل میں آتا ہے کہ شاید ہندوستان میں رہے ہوئے مسلمان کبھی یہ خیال کریں گے کہ ہم جو یہاں رہ گئے تھے، ہم ہی پاکستان جانے والوں سے اچھے رہ گئے ہیں۔ اگر وہ اس وقت کاروباری حالت میں گھبرا رہے ہوں، مگر پاکستان چھوٹا ہے اور وہاں کابل، یعنی افغانستان اور پٹھانستان کا سوال پیدا ہوگیا ہے۔ جس کے باعث امن خطرے میں رہے گا۔''

(مجلس: ۲۸/ جمادی الثانیہ ۱۳۶۸ھ/ ۲۸/ اپریل ۱۹۴۸ء۔ بروز: جمعرات۔ مقام: دہلی)

(ارشادات حضرت شاہ عبدالقادر رائے پوریؒ، ص: 387۔ طبع: رحیمیہ مطبوعات، لاہور)

رحیمیہ کا انگلش ایڈیشن ہماری ویب سائٹ پر پڑھا جاسکتا ہے۔

ممبرشپ کی رقومات کی ترسیل بنام
''ادارہ رحیمیہ علوم قرآنیہ ٹرسٹ لاہور''
الائیڈ بینک مزنگ چونگی برانچ، کوڈ 0533
اکاؤنٹ نمبر 0010030341820010

ادارہ رحیمیہ علوم قرآنیہ (ٹرسٹ) لاہور

رحیمیہ ہاؤس، 33/A کوئینز روڈ (شارع فاطمہ جناح) لاہور
0092-42-36307714,36369089-www.rahimia.org
Email: info@rahimia.org

www.rahimia.org

درسِ قرآن

تفسیر: حضرت مولانا سید محمد میاںؒ

تم بہترین اُمت ہو

كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ ۗ (110:3)

(تم بہترگروہ ہوایک ایسی اُمت کے، جوانسانوں کے (نفع) کے لیے پیدا کی گئی۔ اچھی باتوں کا (ایسی باتوں کا جن کی عمدگی اور بھلائی معروف ہے) حکم کرتے ہو۔ اور منع کرتے ہو منکر سے (ایسی باتوں سے، جن کی قباحت یہاں تک عام ہوچکی ہے کہ ہر شخص انکار کی نظر سے ان کو دیکھتا ہے) اور ایمان لاتے ہو اللہ پر)

اس آیت کے مخاطب صحابہ کرام (رضوان اللہ علیہم اجمعین) ہیں۔ اُن سے فرمایا جارہا ہے کہ وہ اُمتِ محمدیہ جو نوعِ انسان کے فائدے اور نفع کے لیے پیدا کی گئی ہے، تم اُس امت میں سب سے بہتر ہو۔

حضرت شاہ (ولی اللہ دہلوی) صاحبؒ اس کی توضیح وتفسیر کے بعد ارشاد فرماتے ہیں:

خلافتِ خاصہ یہ ہے کہ مذکورہ بالا دونوں باتوں کے لحاظ سے مسلمانوں کا اتفاق موجود ہو۔ اُن کے مذاہب میں بھی اختلاف وافتراق نہ ہو۔ اور نفس کی درندگی اور بہیمیت کے سیلاب سے جو عداوتیں اور دشمنیاں سینوں میں بھر جاتی ہیں، وہ بھی ناپید ہوگئی ہوں۔ یہ دور خیرالقرون کا ہوگا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے دور کو خیرالقرون فرمایا ہے۔ اس کے بعد اُس دور کو، جو اُس سے متصل ہو۔ پھر وہ دور جو اس دوسرے دور سے متصل ہو۔

حضرت شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں:

دورِ فتنہ وہ ہوگا کہ مذہبوں میں اختلاف پیدا ہوجائے اور باہمی عداوت ومخالفت کی وجہ سے مسلمانوں کی الگ الگ جماعتیں ایک دوسرے کے مقابلے میں محاذ قائم کریں۔

حضرت شاہ صاحبؒ اس آیت سے خلافتِ راشدہ پر استدلال کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

اس آیت سے یہ ثابت ہوگیا کہ صحابہ کرامؓ کی معظم ومحترم جماعت:

خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ (بہترین اُمت، جو انسانیت کے نفع کے لیے پیدا کی گئی) کی مصداق تھی۔ اور یہ بات تواتر سے ثابت ہوچکی ہے کہ اقامتِ دین اور دینِ حق کی ترویج واشاعت اور اُس کو مظفر ومنصور کرنے کے لیے اس جماعت نے ایک شخص کو اپنا رئیس اور امیر بنالیا تھا۔ وہ امیر ہر اختلافِ رائے کے وقت باہمی مذاکرے اور مباحثے کے بعد اُن کی شیرازہ بندی کردیتا تھا۔ اور یہ ساری جماعت اعلاءِ کلمۃ اللہ (اللہ کے دین کے غلبے کے لیے اُس کی زیرِ قیادت مشین کے پُرزوں کی طرح کام کرتی تھی۔

خلافتِ راشدہ اسی حقیقت کا نام ہے۔

(عہدِ زرّیں۔ جلد اول۔ ص:101-100)

درسِ حدیث

تشریح: حضرت مولانا خواجہ عبدالحئی فاروقیؒ

ظلم کا نتیجہ

عن ابن عمر أنّ النّبیّ صلّی اللّٰہ علیہ وسلّم قال: ”الظّلم ظُلماتٌ یوم القیامۃ.“ (مشکوٰۃ المصابیح، کتاب الآداب، باب فی الظّلم، الفصل الأوّل)

(حضرت ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”ظلم قیامت کے دن طرح طرح کے اندھیروں کا باعث بن جائے گا۔“)

اس حدیث میں ظلم کی شامت سے خبردار کیا گیا ہے اور اس سے بچنے کی ہدایت کی گئی ہے کہ قیامت میں ظالم سوا اِس کے کہ اندھیرے میں ہاتھ پاؤں مارتا پھرے، اَور کچھ نہ کرسکے گا۔ اس لیے ہمیں سب سے پہلے ظلم کے معنی سمجھ لینے چاہئیں اور پھر اس سے بچنے کی ہر ممکن کوشش کرنی چاہیے۔ ورنہ دوسرے اچھے اعمال اگر کچھ ہوئے بھی تو وہ اس کے آگے ماند پڑ جائیں گے اور ظلم کا اندھیرا ان کی روشنی کو دبائے گا۔

لغت میں ظلم کے معنی ہیں: ”کسی چیز کو اس کے مناسب موقع سے ہٹا دینا“ کوئی کام ایسے وقت کرنا کہ جب اس کا کرنا ٹھیک نہ تھا اور اصطلاحی اعتبار سے ظلم کے معنی ہیں: ”کسی جاندار کی جان و مال اور آبرو پر بے جا حملہ کرنا اور ناحق ستانے پر کمر باندھنا“ جو آدمی کسی کا حق چھینتا ہے یا اُسے خواہ مخواہ دباتا ہے اور شرع اور قانون کی اجازت کے بغیر کوئی دکھ پہنچاتا ہے، وہ ظلم کرتا ہے۔ اس کا لقب ’ظالم‘ ہے۔

اس حدیث میں بتایا گیا ہے کہ ہرگز کسی کو کسی قسم کی تکلیف اور اذیت نہ پہنچاؤ۔ ورنہ قیامت کے دن تم بہت سے اندھیروں میں پھنس جاؤ گے۔ حال آں کہ اس دن تمھیں جنت کی طرف سیدھا راستہ دیکھنے کے لیے روشنی کی ضرورت ہوگی۔ اگر روشنی نہ ہوئی تو تمھیں وہ سیدھا راستہ نہ سوجھے گا۔ اندھیرے میں جدھر بھی جاؤ گے، جہنم میں گرو گے۔ کیوں کہ جنت میں جانے کا راستہ فقط پل صراط سے ہے۔ باقی ہر طرف جہنم ہی جہنم ہے۔ اس لیے ایسے وقت میں اندھیرے سے بڑھ کر خطرناک کوئی چیز نہیں ہوسکتی۔ اگر ایمان اور اچھے کام کی روشنی سے فائدہ اٹھانا ہے تو دنیا میں کسی کو نہ ستاؤ اور کسی کی حق تلفی نہ کرو۔ ورنہ ساری روشنی کو ظالم کا اندھیرا دبالے گا اور اندھیرے میں جہنم میں جا گرنے کے سوا اَور کوئی صورت نہ ہوگی۔

اَور (دوسری) حدیثوں میں اسی مضمون کو اس طرح بھی سمجھایا گیا ہے کہ اللہ کی مخلوق کے ساتھ اپنا معاملہ درست رکھو، ورنہ تم نے جس پر ظلم کیا، وہ حشر کے دن اس کے بدلے تمھاری نیکیاں لے لے گا۔ اور اگر تمھارے پاس نیکیاں نہ ہوئیں تو اس کے بُرے اعمال تمھارے سر تھوپے جائیں گے۔ ایک ظلم ہزار خرابیوں کی جڑ ہے۔ اسلام کی اعلیٰ تعلیم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے حقوق تو معاف کردے گا، لیکن بندوں کے حقوق ہرگز نہ بخشے گا، جب تک کہ وہ بندہ خود معاف نہ کردے گا۔ لہٰذا زندگی میں پوری پوری احتیاط لازم ہے، تاکہ کسی کی حق تلفی نہ ہو اور اپنا نام ظالموں کی فہرست میں شامل نہ ہوجائے۔

www.rahimia.org

اداریہ

اِک معمہ ہے؛ سمجھنے کا نہ سمجھانے کا

اس عہد کا ایک عجیب وغریب اور پیچیدہ ترین المیہ یہ ہے کہ جرم موجود ہے، مگر مجرم کا سراغ نہیں مل رہا۔ دھواں اٹھتا ہے، لیکن آگ دکھائی نہیں دیتی۔ دیا سلائی سے آگ سلگائی جارہی ہے، لیکن اس کے پیچھے کوئی ہاتھ نظر نہیں آتا۔ مطلب یہ ہے کہ دہشت گردی کے ہول ناک واقعات پوری دنیا میں ایک عرصے سے پورے تسلسل کے ساتھ ہورہے ہیں۔ جب بھی کوئی واقعہ رونما ہوتا ہے تو متاثرہ ملک سمیت دنیا بھر سے ایک ردّ عمل آتا ہے اور دہشت گردی کی بھرپور مذمت کی جاتی ہے۔ ابھی پہلے واقعے کی ہول ناکی کی آگ سینے سے بجھتی نہیں کہ کسی اَور جگہ چنگاری بھڑک اٹھتی ہے اور کئی خرمن جلا کر خاکستر کردیتی ہے۔

امریکا میں نائن الیون، ہندوستان میں ممبئی حملے، پاکستان میں آرمی پبلک سکول میں وحشت اور بربریت کا کھیل اور اب فرانس کے شہر پیرس میں خون کی ہولی سمیت دنیا بھر کے مختلف ممالک میں کئی درجن واقعات ہوچکے ہیں۔ ان سب واقعات کی شدید مذمت اور دہشت گردی کا قلعہ قمع کرنے کا ساری اقوام نے یکساں عزم دہرایا تھا، لیکن واقعات کا ایک تسلسل ہے جو کہ تھمنے کو نہیں آرہا۔ آج سائنس اور ٹیکنالوجی کی ترقی یافتہ دنیا میں دہشت گردوں پر قابو نہ پائے جاسکنے نے کئی ایک اہم اور سنجیدہ سوالات کو جنم دیا ہے۔

جیسے کہ ان دہشت گردوں کے پاس جدید ترین آتشین ہتھیار کیا جنگلوں میں اُگتے ہیں یا دنیا کے کسی ترقی یافتہ اور جدید ٹیکنالوجی کے حامل ملک کی فیکٹریوں میں ڈھالے جاتے ہیں؟ دہشت گردوں کے پاس ٹویوٹا (toyota) کمپنی کی انتہائی جدید گاڑیاں اور گولہ وبارود کسی صحرا کی تپتی ریت سے رونما ہوجاتا ہے یا اس کی بھی دنیا میں کوئی جگہ ہے، جہاں یہ سب کچھ منظم نظام کے تحت ایک پیداواری عمل سے گزر کر وجود پذیر ہوتے ہیں؟ اور پھر جدید تجارتی نظام کے تحت اپنے سیریل نمبروں کے اندراجات کے ساتھ ان کی فروخت ہوتی ہے۔ دہشت گردوں کے پاس دنیا کی ہر کرنسی میں سرمائے اور کیش کے انبار کہاں سے آتے ہیں؟ ان کے جدید سیٹلائٹ ٹیلی فون، وائرلیس اور ویب پیغامات کے نظام کو پکڑنے والی ٹیکنالوجی کیا ابھی ایجاد نہیں ہوئی؟ اور یہ مٹھی بھر دہشت گرد سائنس وٹیکنالوجی میں دنیا سے زیادہ ترقی کر گئے ہیں؟ یہ سب کچھ دہشت گردوں کے پاس کہاں سے اور کس راستے سے پہنچتا ہے؟ کیا یہ بات غور اور لائق توجہ نہیں ہے اور پھر اس پر دنیا کی بڑی طاقتیں خاموشی کیوں سادھے بیٹھی ہیں۔

پاکستان کے جوہری ہتھیاروں پر سوال اٹھانے والے امریکا اور ان کے تحادیوں سے یہ سوال کوئی کیوں نہیں پوچھتا کہ اس کی امداد اس کے نام نہاد ''دشمنوں'' تک کیسے پہنچ جاتی ہے؟ مثلاً عراق میں ٹویوٹا کی نئی نویلی جدید ماڈل کی گاڑیوں کی ایک پوری کھیپ داعش کے زیر استعمال کیسے آئی؟ جب کہ واشنگٹن میں ٹویوٹا کے ڈائریکٹر پبلک پالیسی و کمیونی کیشنز کہتے ہیں کہ: ''ہم نے مشرقِ وسطیٰ میں ٹویوٹا کی سپلائی چین (Chain) سے امریکا کو آگاہ کیا ہے اور یہ بھی بتایا ہے کہ اس سپلائی چین کو محفوظ رکھنے کے لیے ٹویوٹا کون سے طریقے آزماتا ہے۔'' اسی طرح افغانستان میں کروڑوں ڈالر مالیت کے جدید ترین امریکی ہتھیار افغانستان میں افغان حکومت کے مخالف جنگ جوؤں کے ہاتھ کیسے لگ جاتے ہیں؟ اسی طرح سے شام میں قومی حکومت کے خلاف برسرِ پیکار باغیوں کی تنظیم فری سیرین آرمی کے ہاتھ ٹویوٹا کمپنی کے نئے اور جدید ٹرکوں کی خاصی بڑی تعداد کیسے آگئی؟ ایسے ہی لیبیا میں وہاں کی قومی حکومت کو ملیا میٹ کرنے کے لیے باغیوں کے ہاتھوں میں اچانک جدید اسلحہ کہاں سے آگیا تھا؟ جنھوں نے نیٹو کے زیر سایہ لیبیا کی قومی فوج کو تتر بتر کردیا تھا۔ کیا وہ اپنے ذاتی وسائل اور بل بوتے پر ایک مضبوط قومی اور مقبول حکومت کو گرانے کی صلاحیت رکھتے تھے؟

کیا یہ سارے معاملات 'اک معمہ ہے سمجھنے کا نہ سمجھانے کا' والے ہیں یا ہم اس بات پر قادر ہیں کہ ان معاملات کے پس پردہ کرداروں کی کھوج لگا سکیں؟ اور دنیا کے سامنے ان ''کرداروں'' بلکہ بدکرداروں کو بے نقاب بھی کرسکیں۔ ان معموں کو سمجھنے کے لیے ہمیں سرمایہ دارانہ نظام کے ان خوف ناک حربوں کی تاریخ اور طریقہ ہائے واردات کو پیش نظر رکھنا ہوگا کہ وہ اپنے مفادات کے حصول اور اپنی بقا کے لیے کن کن مکروہ دھندوں میں ملوث رہا ہے۔ اور یہ جو کچھ بھی ہورہا ہے یہ اسی کے مکروفریب کی نئی شکلیں ہیں کہ اس نے ساری دنیا کو دہشت گردی کے ''ٹرک کی بتی'' کے پیچھے لگا کر اپنے عالمی ایجنڈے کی تکمیل میں مصروف کار ہوتے ہوئے دنیا بھر میں اسلحے کی غیر قانونی تجارت میں مصروف ہے۔

امریکا، برطانیہ اور اس کے اتحادیوں کی سرکاری اور نجی فیکٹریوں میں بننے والے مہلک اور جدید ہتھیار دنیا بھر میں بیچے جاتے ہیں، جن سے بہ یک وقت کئی فائدے اٹھائے جاتے ہیں۔ مثلاً اپنے سلحے کی مہنگے داموں فروخت اور اپنی مخالف حکومتوں کو گرانے کے لیے بلاامتیاز مذہب اور نسل مسلمانوں سمیت دنیا بھر کی شدت پسند اور دہشت گرد تنظیموں کو اسلحے کی سپلائی سے ایک خاص منصوبے کے تحت دہشت گردی کی سرپرستی کی جاتی ہے، تاکہ پوری دنیا کو مسلسل عدم استحکام کا شکار رکھا جائے اور ان میں سرمایہ دارانہ، طاغوتی اور سامراجی نظام کے خلاف کوئی اجتماعی طاقت نہ اُبھر سکے۔ اس کے لیے وہ خود شدت پسندوں کے گروہ بھی تخلیق کرتے ہیں۔ انھیں جدید اسلحہ استعمال کرنے اور چھوٹے دیسی ہتھیار بنانے کی تربیت بھی دیتے ہیں۔ ڈالروں اور کرنسی کے ساتھ دنیا کے اہم ایریاز تک پہنچ (access) بھی دلواتے ہیں۔ بم دھماکے، فائرنگ اور حقیقی طور پر معصوم انسانوں کو قتل کروانے کے ساتھ ساتھ اپنے جدید سٹوڈیوز میں انسانوں کو ذبح کرنے کی خوف ناک مصنوعی سی ڈیز اور فلمیں بنا کر دنیا میں سنسنی پیدا کرکے تیسری دنیا کے ملکوں کے خوف زدہ حکمرانوں کو اپنے سامراجی اتحاد کا حصہ بھی بناتے ہیں۔ ان سارے حربوں کے ساتھ دنیا میں امن قائم کرنے کی ''جدوجہد'' میں بھی مصروف ہیں۔ دہشت گرد قوتوں کو اسلحے کی ترسیل کے طریقۂ کار اور شبوتوں کو ہم کسی اَور موقع کے لیے اٹھا رکھتے ہیں۔ (مدیر)

www.rahimia.org

عالمی منظر نامہ

مرزا محمد رمضان، راولپنڈی

2015ء کے مستقبل کے بارے میں متنین کردہ رجحانات

پہلی اینٹ اپنے اوپر بننے والی عمارت کے خدوخال اور آئندہ اس کی شکل وصورت کا جس طرح تعین کر دیتی ہے، اسی طرح ایک سال اگرچہ صدی کا سوواں حصہ بنتا ہے، مگر اس میں اختیار کیے گئے اقدامات بھی مستقبل میں وضع ہونے والی عالمی تشکیل کے رُخ کا تعین کر دیتے ہیں۔ اگرچہ سال 2015ء گزر گیا، لیکن اس دوران وقوع پذیر ہونے والے واقعات نے بھی اگلے سالوں میں بین الاقوامی سیاست کی بساط اور اس کے خانوں پر چلنے والے پیادوں اور رُخوں کا میلان ظاہر کر دیا ہے۔

سرمایہ دار کمپنیاں جس سرمائے کے بل بوتے پر منڈیوں پر قبضہ جمائے ہوئے تھیں، آج انھیں اپنی بقا کے لالے پڑے ہوئے ہیں ہے۔ ایشین اقتصادی ماڈل' یورپین اقتصادی ماڈل کو عبرت ناک شکست سے دو چار کیے ہوئے ہے۔ فنانشل ٹائم کی 20 اکتوبر 2015ء کی رپورٹ کے مطابق BT گروپ برطانیہ کی سب سے بڑی موبائل کمپنی EE کو خرید رہا ہے، جب کہ 3UK نامی کمپنی ایک دوسرے گروپ OTO میں ضم ہونے کی منصوبہ بندی کر رہی ہے۔ اسی طرح امریکا میں مارٹن شکریلی کی ایک کمپنی تیورنگ فارما سیوٹیکلز نے کینسر اور ایڈز کی ایک دوائی ''ڈارا پرم'' کے حقوق ''امپیکس لیبارٹریز'' سے خرید کر اس کی قیمت میں 5,555 گنا اضافہ کر دیا۔ یعنی اس کی قیمت 13.50 ڈالر سے بڑھا کر 750 ڈالر کر دی۔ اسی طرح ''روڈلس'' نے BT کی ایک دوائی سائیکلوسیرائن کی، جو کہ 30 کیپسول کی پیکنگ کی قیمت -/500 ڈالر سے بڑھا کر -/10,800 ڈالر تک لے گئی۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ایسی کون سی قیامت آنے والی ہے، جس کی وجہ سے یہ کمپنیاں راتوں رات عوام کے معاشی قتل کے اس قدر بھیانک اقدامات کر رہی ہیں۔ ایک بات تو طے ہے کہ یہ کمپنیاں روزِ اول سے ہی ایسے اقدامات کرتی چلی آ رہی ہیں۔ دوسرا یہ کہ چائنیز کمپنیوں کے مارکیٹ میں مدمقابل آنے سے انھیں اپنی موت نظر آ رہی ہے۔ لہٰذا اپنی سابقہ روش کے ہاتھوں مجبور ہو کر ان کی اپنی مارکیٹوں میں مسابقت کے نظریے کے تحت چینی کمپنیوں کا داخلہ گویا امریکیوں کے لیے موت کا پروانہ ثابت ہو رہا ہے۔ چین کی دس بڑی کمپنیاں 2015ء میں GOING GLOBAL کے نعرے کے تحت دنیا کی منڈیوں میں سرمایہ کاری کرنے کے لیے میدان میں نکلی ہیں۔ جن میں نمایاں ترین نام درج ذیل ہیں:

1۔ لی نوو 2۔ ڈالیان وانڈا 3۔ فوسن 4۔ ہواوے 5۔ وانیا نگ
6۔ علی بابا 7۔ ژیومی 8۔ پربیڈو 9۔ ٹین سینٹ 10۔ برائٹ فوڈ

روڈیم گروپ کے مطابق جب سے چین 2001ء میں ڈبلیو ٹی او کا رُکن بنا، اس سال سے امریکا میں مصنوعات کے شعبے میں ملازمتوں کا رُجحان گرنا شروع ہو گیا اور چینی مصنوعات کی امریکا کو برآمدات میں اضافہ ہونا شروع ہو گیا۔ 2014ء کے آخر تک چینی کمپنیوں کی امریکا میں پراپرٹی، ہوٹل کی صنعت اور جدید ٹیکنالوجی میں سرمایہ کاری 12 بلین ڈالر تک پہنچ گئی۔ ان اقدامات سے ظاہر ہو رہا ہے کہ چینی کمپنیوں کے مدمقابل آنے سے یورپین کو اپنی بساط اُلٹتی ہوئی نظر آ رہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی کوشش ہے کہ جلد سے جلد عوام کو اس حد تک لوٹ لیا جائے کہ اس کے بعد ان میں زندہ رہنے کی سکت ہی ختم ہو جائے۔

دوسری طرف مشرقِ وسطیٰ جہاں سامراج اپنے پیادوں اور رُخوں کے ذریعے گزشتہ صدی سے مختلف قسم کی چالیں چل رہا تھا، اس عرصے میں اس کے کئی پیادے اور گھوڑے دَل کی چال چلتے رہے۔ ایک وقت تو ایسا تھا کہ فوجی تمرین کے اس کھیل میں کوئی اسے چیلنج کرنے والا نہیں تھا۔ اس خطے میں جو بساط بچھائی گئی تھی، اس کے پیادے، رُخ اور گھوڑے ہی میدان مارتے رہے۔ اسے شہ ملنی تو درکنار، اس کے پیادوں کا مقابلہ کرنا بھی محال ہو گیا تھا۔ اکیس ویں صدی کا آغاز دنیا میں کئی تبدیلیوں کا پیش خیمہ ثابت ہوا۔ 2001ء میں ہی ایس سی او وجود میں آئی۔ اس ادارے نے پہلے پہل علاقائی ملکوں میں استحکام کے لیے کام کیا۔ اس کے بعد اس کا کردار عالمی سیاست میں نکھرنے لگا۔ 2011ء میں شام کا بحران شروع ہوا۔ امریکا سیاست کے محاذ پر شکست کھانے کے بعد گوریلا جنگ کی طرف بڑھتا چلا گیا۔ اس نے داعش بنا کر جنگ کا آغاز کر دیا۔ وہ اپنے ان ہتھکنڈوں کے ذریعے مشرقِ وسطیٰ کے دو اہم ملکوں کو شکست سے دو چار کر چکا تھا۔ چناں چہ اسی حکمتِ عملی کے تحت اس کا اگلا ہدف شام تھا۔ گویا شام کے محاذ نے اسے خطے کا بلاشرکت غیرے شہنشاہ بنانا تھا، لیکن قدرت کا فیصلہ کچھ اَور ہی تھا۔ اس دوران رُوس کو علاقائی طاقتوں کے تعاون کے ساتھ میدان میں اُترنا پڑا۔ روس نے داعش کے خلاف مقابلے کی شان دار حکمتِ عملی تشکیل دی، جو دو پہلوؤں پر مشتمل تھی: سیاسی محاذ اور فوجی اقدامات۔ سیاسی طور پر روس نے علاقائی ملکوں کو ساتھ ملایا، جن میں ایس سی او کے علاوہ لبنان، ایران اور عراق شامل تھے۔ اقوامِ عالم میں اس مسئلے کے بارے میں آگاہی پیدا کرنے کے لیے روس نے اقوامِ متحدہ کی جنرل اسمبلی کو بھی اس کا ذریعہ بنایا۔

جہاں تک فوجی اقدامات کا تعلق ہے، اس میں برّی، بحری اور فضائیہ کا بھی استعمال کیا گیا۔ ایک دفاعی تجزیہ نگار کے مطابق داعش کے خلاف جنگ جیتنے کے لیے 5 ہزار فوجی دستے، اسپیشل فورسز، چھاتہ بردار جو چیچن فارمیشنز پر مشتمل ہوں گے، مزید فراہم کیے جائیں گے۔ اس حکمتِ عملی کا نتیجہ ہے کی داعش کی تشکیل جن فورسز پر مشتمل تھی، حملے کے نتیجے میں داعش کے ہراوّل دستے کے فوجی اپنی اپنی کمین گاہوں کی طرف جو کینیڈا، جرمنی، فرانس، اُردن اور کویت وغیرہ میں واقع ہیں، جان بچا کر بھاگ گئے۔ شام میں روسی فوجیوں کی ان کامیاب کارروائیوں کے نتیجے میں امریکی بلاک کی جھنجھلاہٹ ترکی آرمی کے ذریعے سے ایک روسی جہاز پر شامی سرحدوں کے اندر حملے اور اس کو مار گرانے کی صورت میں سامنے آئی ہے۔ امریکا کی اس حرکت نے اپنے آپ کو مزید کمزور کر لیا ہے۔ شام اور روس کا مؤقف عالمی رائے عامہ پر اپنے گہرے اثرات مرتب کرتا ہوا نظر آ رہا ہے۔

مجالس ؛ افاداتِ علم وحکمت

ادارہ رحیمیہ علومِ قرآنیہ (ٹرسٹ) لاہور کے قیام سے ہی یہ روایت موجود رہی ہے کہ نمازِ جمعہ کے بعد حضرت اقدس مولانا مفتی عبدالخالق آزاد رائے پوری مدظلہٗ کے ساتھ احباب کی استفادہ نشست ہوتی ہے۔ جنوری 2015ء کے شمارے سے ان افادات کو شائع کر کے ہم مجلّہ رحیمیہ کے تمام قارئین کو اس استفادہ نشست میں شامل کر رہے ہیں۔ اس مجلس کی ریکارڈنگ اور جمع وترتیب کے فرائض جناب قاری عبدالرشید نے انجام دیے۔ قارئین سے گزارش ہے کہ اس سلسلے میں ادارہ کو اپنی رائے سے ضرور آگاہ کریں۔ (مدیر)

مجلس نمبر 3/4۔ 26 دسمبر 2014ء - مقام: ادارہ رحیمیہ علومِ قرآنیہ، لاہور

سوال: ہمارے ملک میں جمہوریت اور مارشل لا کی بحث ہمیشہ میڈیا کی رونق رہتی ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ بہترین مارشل لا سے بدترین جمہوریت اچھی ہے۔ اور ایک لیڈر نے کہا تھا کہ: ''بہترین انتقام جمہوریت ہے۔'' کیا پاکستان میں حقیقی جمہوریت کبھی موجود رہی ہے؟

حضرتِ اقدس: ہمارے ہاں جمہوریت کا بڑا چرچا کیا جاتا ہے، لیکن جمہوریت کے بنیادی اُمور اور اس کے تقاضے ہمارے ہاں موجود نہیں ہیں۔ یہاں سب سے بڑی پارٹیوں نے کبھی جمہوری تقاضو کو سکھانے کے لیے اپنے ورکروں کے لیے کوئی سٹڈی سرکل قائم نہیں کیا ہے۔ یہ نہیں بتلایا کہ لفظِ سیاست کا مطلب کیا ہے۔ کسی پارٹی کے سربراہ سے ہی پوچھ لیں کہ لفظِ سیاست کسے کہتے ہیں اور کس زبان کا لفظ ہے۔ جمہوریت کا مطلب کیا ہے اور اس کے تقاضے کیا ہیں۔ کسی جمہوری نظام میں ووٹ کی حقیقت کیا ہوتی ہے۔ ووٹ کا مطلب تو یہ ہے کہ میں اپنی آزادی اور حق خودارادیت سے اپنے میں سے کسی ایک کو اپنی نمائندگی کے لیے منتخب کروں۔ جب کہ یہاں کی صورتِ حال یہ ہے کہ مجھے تو یہ آزادی ہی حاصل نہیں ہے۔ سول سوسائٹی کی تشکیل کے لیے بھی ایک تنظیم کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس کے اپنے تنظیمی تقاضے ہوتے ہیں، جب کہ عسکری تنظیم کی اپنی ضرورت ہوتی ہے۔ سول تنظیم کو لچک دار رویے رکھتے ہوئے عسکری تنظیم سے زیادہ بہتر طور پر منظّم ہونے کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہاں ہم سیاسی پارٹی، سول سوسائٹی اور جمہوریت کی بات کرتے ہیں۔ جمہوریت تو ایک ادارتی نظام کے ساتھ کام کرنے کا نام ہے۔ جب تک اجتماعی سوچ کے ساتھ کسی ادارے، پارٹی کے داخلی نظام میں میں جمہوریت نہیں ہوگی تو باہر سوسائٹی میں کیسی جمہوریت ہوگی۔

پھر کسی ملک کو چلانے کے لیے مینجمنٹ کے لیے ضروری ہے کہ آپ کو تمام چیزوں کا ادراک بھی ہو اور اعداد وشمار بھی آپ کے پاس ہوں۔ اور آپ کی پلاننگ بھی پرفیکٹ ہو۔ یہاں تو آپ کی سول حکومتوں کی یہ نااہلی رہی ہے کہ ان میں ادارتی عمل سرے ہی سے نہیں ہے۔ اگر اپنی ذاتی صلاحیت کی بنیاد پر ہوا ہے، جیسا کہ پاکستانی تاریخ میں بعض لیڈروں کی بڑی تعریف کی جاتی ہے، انھوں نے بھی سوائے اپنی ذات کے کوئی ادارتی عمل کیا ہو تو دکھا دیں۔ وہ خود اٹھارہ اٹھارہ گھنٹے کام کر کے فائلیں نمٹا دیتے تھے۔ اگر وہ اپنی غیر معمولی ذہانت کی بنیاد پر کچھ فیصلے کر بھی لیتے تھے، لیکن آپ بتائیں انھوں نے ملک اور قوم کے لیے کوئی ادارہ یا سسٹم کھڑا کیا؟ اگر انھوں نے کوئی ادارہ بنایا ہوتا تو آج اس کے جمہوری ثمرات سامنے ہوتے۔ جمہوریت تو نام ہی ادارتی عمل کا ہے۔ وَن مین شو کا نہیں ہے۔ ہم کہتے ہیں کہ جب فوج آتی ہے تو وہ وَن مین شو ہوتی ہے۔ حال آں کہ کوئی آرمی چیف یا کوئی جرنیل اپنے کور کمانڈروں کی رائے اور مشورے کے بغیر کوئی Decision نہیں لیتا۔ فوج کا فیصلہ اجتماعی ہوتا ہے۔ اگر اختلافِ رائے بھی ہو تو اختلافِ رائے بھی اُس کے مختلف پہلوؤں کو نکھارنے کے تناظر میں ہوتا ہے۔ لیکن اگر رائے میں سب کا اتفاق ہو گیا تو پھر فیصلہ ساری کانفرنس کا ہوتا ہے۔ کسی ایک کا نہیں۔ دنیا میں جمہوریت کا اصول بھی یہی ہے۔

یہاں پاکستان میں پارلیمنٹ میں پہنچنے کا کیا معیاری فارمولا ہے؟ جس کے پاس دو چار کروڑ روپے ہوں، وہ جاہل انگوٹھا چھاپ ہی کیوں نہ ہو، قانون وانصاف کی تعلیم و تربیت سے بے خبر ہو۔ وہ قانون ساز پارلیمنٹ کا ممبر بن جاتا ہے۔ 1937ء سے اب تک جتنے الیکشن ہوئے ہیں، ان میں سے آپ ایک الیکشن فیئر دکھا دیں کہ جس میں عوام نے ووٹ دیا ہو۔ یہاں برطانیہ نے جو نام نہاد جمہوریت کا نظام قائم کیا تھا، اس میں کبھی صحیح ووٹنگ کسی الیکشن میں نہیں ہوئی۔ سرمایہ دارانہ نظام میں الیکشن فیئر ہو ہی نہیں سکتا۔ کیوں کہ جہاں سرمائے اور جاگیردار کا جبر ہو، وہاں حقیقی جمہوری نظام نہیں آ سکتا۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ 1937ء سے لے کر 1970ء تک جتنے الیکشن ہوئے ہیں، اُس میں عوام نے بالغ رائے دہی کی بنیاد پر شرکت ہی نہیں کی۔ ووٹ صرف بی اے پاس اور سرمایہ دار کا ہوتا تھا۔ اس کے علاوہ کسی کو بھی ووٹ ڈالنے کا حق نہیں تھا۔ 1937، 1946ء، اُس کے بعد 1952ء، اُس کے بعد جو ریفرنڈم کرایا، ان تمام میں یہی طریقہ تھا۔ پاکستان میں 1970ء میں پہلی بار بالغ رائے دہی کی بنیاد پر الیکشن ہوا اور اُس الیکشن میں بھی سرمایہ دار، جاگیردار اور وڈیرے کے ماتحت سرمایہ داری نظام چلانے کے لیے چند غریب کامیاب ہوئے۔ ذرا جنوبی پنجاب اور سندھ میں چلے جائیں، ہاری کو تو پتہ ہی نہیں کہ ووٹ کیا بلا ہوتی ہے۔ جو رہتا ہی ان کی جاگیر کی زمین پر ہے۔ اگر وہ اُس جاگیر کے خلاف ووٹ دے دے تو اُس بے چارے کی جھونپڑی بھی گئی۔ ان علاقوں میں چلے جاؤ۔ ان میں جو بڑا مگرمچھ اور مارکیٹ کا مافیا ہے، اس کے خلاف بات کر کے دیکھیں، وہ آپ کی جھگی اٹھا کر باہر پھینک دے گا۔

اگر جمہوریت کی تعریف کسی ادارے کی بنیاد پر دیکھی جائے تو سب سے زیادہ جمہوریت کس میں ہے؟ فوج میں! کہ جس میں بغیر کسی نسلی فرق وامتیاز کے عسکری تنظیمی تقاضوں کے مطابق سربراہان کا تقرر ہوتا ہے۔ اگر میرٹ سے ہٹ کر کوئی گڑبڑ ہوتی ہے تو وہ سیاسی قیادت کرتی ہے۔ یعنی سول سیاسی نظام کو قائم کرنے کی دعوے دار غیر جمہوری اور غیر ادارتی سوچ رکھنے والی قیادت جمہوری تقاضوں کی نفی کرتی ہے۔

www.rahimia.org

خطبات و بیانات

افادات: حضرت اقدس مولانا مفتی شاہ عبدالخالق آزاد رائے پوری دامت برکاتہم العالیہ

جانشین حضرت رائے پوری رابعؒ و مسند نشین خانقاہِ عالیہ رحیمیہ رائے پور

حضرت اقدس مولانا مفتی شاہ عبدالخالق آزاد رائے پوری دامت برکاتہم العالیہ نے 16 رمئی 2014ء کو ادارہ رحیمیہ علومِ قرآنیہ لاہور میں نمازِ جمعہ کے شرکا سے خطاب فرمایا، جس کے چند اہم اقتباسات درجِ ذیل ہیں:

دینی تعلیمات اور سوسائٹی کے اجتماعی امور

''معزز دوستو! جب ہم اجتماع کی بات کرتے ہیں تو ہر اجتماع، ہر سماج، ہر سوسائٹی جن بنیادی اساسی اُمور پر مشتمل ہوتی ہے اور جس کی وجہ سے اُسے اجتماع کہا جاتا ہے، انھیں سمجھیں۔ انھیں کی وجہ سے اُسے ایک سماج کی شناخت حاصل ہوتی ہے۔ یہ اہم تر بات ہے کہ سوسائٹی کے اجتماعی اُمور کیسے سرانجام پائیں گے۔ دین کی روشنی میں ان امور پر عمل درآمد کا طریقۂ کار کیا ہوگا۔ بحیثیتِ مجموعی انسانیت ترقی کی منازل کیسے طے کرے گی۔ دین اسلام کی روشنی میں ان امور کو سمجھنا ضروری ہے۔

حضرت الامام شاہ ولی اللہ دہلویؒ فرماتے ہیں کہ: نبی اکرمؐ کی بعثت ایک بین الاقوامی اجتماع کے قیام کے لیے ہوئی، کہ کل انسانیت کا بین الاقوامی اجتماع، ایک بین الاقوامی انسانی معاشرہ قائم کرے۔ دین اسلام نے یہ بتلایا کہ اُس اجتماع کے بنیادی دائرے کیسے ترقی کریں گے۔ اُس کے شعبوں میں اجتماعیت کیسے قائم ہوگی۔ نبی اکرمؐ کی بعثت اس حوالے سے ہوئی۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ ایک مسلمان کا نقطہ نظر اجتماعی ہونا چاہیے۔ وہ چیزوں کو اجتماعی حوالے سے دیکھے۔ اُس کا علم و فکر انسانی اجتماع کے اجتماعی تقاضوں کے تناظر میں سامنے آنا چاہیے کہ سوسائٹی کا اجتماعی نقطہ نظر کیا ہے۔ نظریۂ زندگی کیا ہے۔ کیا یہ نظریۂ زندگی مجموعی طور پر انسانیت کے مفاد کا ہے۔ یا یہ نظریۂ زندگی محض کسی ایک فرد، گروہ، ایک طبقے یا ایک نسل کے مفاد کا ہے؟ اُسے اس حوالے سے درست اور صحیح رائے قائم کرنی ہے۔ فیصلہ کرنا ہے۔

مسلمان کا اجتماعی نقطہ نظر، اس کا نظریۂ زندگی کل انسانیت کی فلاح و بہبود کے تناظر میں ہوتا ہے۔ وہ جس قوم کا حصہ ہے، جس دھرتی کا باسی ہے، جس معاشرے کا فرد ہے، جس اجتماع کی اجتماعیت میں اس کی انفرادیت گم ہے، اس اجتماع کی فلاح و بہبود کا نقطہ نظر کیا ہے۔ اس کے علم و فکر اور فلسفے کی اساس اور بنیاد کیا ہے۔ مسلمان کو یہ طے کرنا ہے۔ کیا اس کا نظریہ مجموعۂ انسانیت کے مفاد کا ہے؟ اپنے معاشرے کی فلاح و بہبود کا ہے؟ یا ایک خاص گروہ یا طبقے کی بالادستی کی بنیاد پر غلامانہ ذہنیت اور انسانیت دشمنی کا ہے۔ یہ اجتماعی تقاضا اُس کے پیشِ نظر ہونا چاہیے۔ یہ سوسائٹی کے اجتماعی امور میں دینی تعلیمات کا بنیادی حصہ ہے۔''

دین اسلام ایک نظام اور سسٹم دیتا ہے

حضرت اقدس رائے پوری مدظلہٗ نے خطاب کرتے ہوئے مزید فرمایا:

''دنیا میں ہر کام کرنے کے کچھ معیارات ہوتے ہیں، جن پر اُن کاموں کو پرکھا جاتا ہے۔ ایسا کبھی نہیں ہوتا کہ دنیا میں کسی شعبے کے لیے اُمور طے کیے جائیں اور ان کاموں کے پرکھنے کا کوئی طریقۂ کار موجود نہ ہو۔ جانچ پڑتال دنیا کے ہر کام میں ہوتی ہے، اس کے بغیر کوئی نظام نہیں چل سکتا۔ ہر شعبے میں کام کے جو مراحل طے کیے جاتے ہیں، ان مراحل کا جائزہ لیا جاتا ہے کہ ہم نے جو بنیادی اُمور طے کیے تھے، جن مقاصد و اہداف کے تحت کام شروع کیا گیا تھا، کیا وہ مقاصد و اہداف حاصل ہوگئے؟ وہ کام جو مطلوب و مقصود تھا، وہ معیار کے مطابق ہوا یا نہیں؟ زندگی کے ہر شعبے میں ہر چیز پرکھی جاتی ہے۔ اسی سے ہی ترقیات کا عمل آگے بڑھتا ہے۔ دین اسلام نے بھی انسانیت کی ترقی کے معیارات طے کیے ہیں۔ ان کے بھی جانچنے پرکھنے کا ایک طریقہ ہے۔ دین اسلام ایسا نہیں، جیسا کہ روایتی طور پر ہم نے سمجھ لیا کہ یہ کچھ وعظ اور اصلاح کے اُمور ہیں۔ ہماری مرضی اس پر عمل کریں یا نہ کریں۔ اور پھر عمل کریں تو کتنی مقدار اور کس معیار کا کریں۔ یہ بھی متعین نہ ہو۔ ایسا نہیں ہے۔ دین اسلام ایک نظام دیتا ہے۔ دین کا لفظی معنی بھی سسٹم اور نظام ہے۔ یعنی اُمور کا تعین اور اُن اُمور کی جزا و سزا کا ایک باقاعدہ نظام، اسے ہی دین کہا جاتا ہے۔ جب تک جزا و سزا کا اور کسی کام کے کرنے کا باقاعدہ نظام نہ ہو تو وہ عمل نتیجہ خیز نہیں ہوتا۔ دین اسلام ایک نظام دیتا ہے اور دنیا کے ہر نظام کی طرح اس کا بھی اپنے معیارات کو پرکھنے کا ایک نظام موجود ہے۔

جب دین ایک نظام ہے تو اس نظام کا انسانی سوسائٹی میں قائم ہونا، اس کے مطابق ہمارے انفرادی اور اجتماعی اعمال کا ہونا' ناگزیر ہے۔ دیگر مذاہب کی طرح یہ دین نہیں ہے۔ بہت سے مذاہب ہیں جو محض وعظ و نصیحت کا مجموعہ ہیں۔ دین اسلام ایسا نہیں ہے۔ دین اسلام نہ صرف انسانی زندگی کی اصلاح، تربیت اور تزکیے کے اعمال اور اُصول بتلاتا ہے، بلکہ انھیں عملی طور پر قائم کرنے کا طریقہ بھی بتاتا ہے۔ ایک مسلمان پر یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ دین کے نظریات، تعلیمات اور افکار کو پرکھے، ایمان لائے اور اپنے اُس ایمان کے مطابق اُن اصولوں کو عمل میں لانے کی جدوجہد اور کوشش بھی کرے۔ اُس کے لیے انفرادی اور اجتماعی طور پر کردار بھی ادا کرے۔ اور پھر اس تناظر میں دین اسلام یہ ذمہ داری بھی عائد کرتا ہے کہ یہ کل انسانیت کی فلاح و بہبود کا دین ہے۔ لہٰذا اس کا اجتماعی طور پر پوری سوسائٹی میں روبہ عمل آنا' لازمی اور ضروری ہے۔ کل انسانیت اس کی مخاطب ہے۔ انسانیت میں اجتماعی طور پر ان اُمور پر عمل درآمد ہونا چاہیے۔ تاکہ انسانیت دنیوی فلاح اور اُخروی فلاح کے مراحل سے گزرے۔ یہ انفرادی دین نہیں ہے کہ لوگ انفرادی طور پر اس کے کچھ اعمال سرانجام دے لیں اور سمجھیں کہ ہمارے اوپر عائد ذمہ داری پوری ہوگئی۔''

www.rahimia.org

علم وفکر پر اثر انداز ہونے والے عوامل

حضرت اقدس رائے پوری مدظلہٗ نے خطاب کرتے ہوئے مزید فرمایا:

''ہم دوسو سال تک غلامی کے ماحول میں رہے۔ غلامی کے اس دوسو سالہ دور میں ہمارے گرد وپیش میں علم کے جو سانچے، جو طریقے اور زاویے متعین کیے گئے، وہ نوآبادیاتی دور کے علم کے تناظر میں ہیں۔ یعنی اس برعظیم پاک وہند کے انسانوں کو ایک عالمی سامراجی طاغوتی قوت کی کالونی بنائے رکھنے کے لیے ہیں۔ اس کالونی ازم کے نالج کی اساس پر ہماری سوسائٹی کے تمام علمی، فکری اور نظریاتی سوتے پھوٹے اور انھیں پوری سوسائٹی میں فروغ دیا گیا۔ یہاں کی یونیورسٹیاں، کالج، مدرسے، خانقاہیں، پیر خانے اور مسجدوں کے رہنماؤں اور یہاں کے سیاسی لیڈروں کے علم کا جائزہ لینے کی ضرورت ہے کہ کیا یہ کالونیل ازم (colonialism) کے علم کے زیر اثر ہیں یا ایک آزاد قوم، آزاد معاشرت، انسانی سوسائٹی کی ترقی اور فلاح و بہبود کے فکر ونظریے کے ساتھ وابستہ ہیں۔ علم کی نوعیت کیا ہے؟ انسانی معاشرے کی ساخت کیا ہے؟ اس میں نظریاتی Concept بڑا بنیادی کردار ادا کرتا ہے۔ یہ نظریاتی Concept غلامانہ ذہنیت پر مشتمل ہو، مقصدِ زندگی اغیار کی سیاست، معیشت اور فکر وفلسفے کو فروغ دینے کے تناظر میں ہو تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اُس اجتماع کا نظریہ فاسد ہو چکا۔ اُس کی سوچ غلامی کی حامل بن چکی۔ اس کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں۔ اور اگر اس غلامانہ ذہنیت، غلامی پر مبنی علم کو اسلام کے دلائل کے ساتھ، اسلام کے لبادے میں، مذہب کے عنوان سے پیش کیا جائے تو یہ اُس سے بھی زیادہ خطرناک بات ہے۔

آج ہمیں اپنے علم کا جائزہ لینا ہے کہ کیا یہ انسانیت کی فلاح و بہبود اور اسلام کی بنیادی تعلیمات کے مطابق ہے؟ یا غلامی کے زمانے میں علم وفکر کے جو زاویے، جو گروہیتیں، جو دانش ورانہ بحثیں کی گئیں، اس دور میں جو مفکرین، حتیٰ کہ جو مفتی، مفسر، محدث، پروفیسر اور دانش ور پیدا کیے گئے، اُن کے نظریے اور علم کے ڈانڈے کہاں ملتے ہیں؟ ان کا نظریہ ایک آزاد قوم کا ہے یا غلام قوم کا؟ 1835ء میں جو نظریۂ تعلیم اس سوسائٹی پر مسلط کیا گیا، اُس میں 'علم' کے سوتے کہاں سے پھوٹے ہیں؟ کیا یہ حقیقت نہیں کہ ہم ایک غلامانہ ذہنیت کے تناظر میں علم کی موٹی لٹاتے رہے۔ اور غلامی کا کردار ادا کرتے رہے۔ معاشیات کے اعداد وشمار پیش کرتے ہیں تو عالمی سرمایہ دارانہ نظام کے موافق۔ سیاسی نقطہ نظر سے بحث مباحثہ کرتے ہیں تو اس کا مرکز ومحور غلامی کے زمانے کی سامراجی سیاست ہوتی ہے۔ تمام سیاسی علمی نظریات عالمی سرمایہ داری نظام کی سوچ کے تابع ہیں۔ تمام معاشی اعداد وشمار اور بجٹ، معاشی اور مالیاتی جادوگری کے تحت عالمی سرمایہ داری نظام کے مفادات کے مطابق وجود میں آتے ہیں۔ کبھی ہم نے سوچا کہ ہمارے بجٹ کے بننے سے پہلے عالمی سرمایہ داری مفادات کے حامل لوگ ہمارے ملک کا وزٹ کیوں کرتے ہیں؟ ہمارے ملک کے وزرائے خزانہ اور وزرائے اعظم سے ملاقاتیں کیوں کرتے ہیں؟ وہ ہمیں بتلاتے ہیں کہ ہمارے ملک میں معاشی طور پر کیا اقدامات کیا ہونے چاہئیں۔ وہ اس کی علمی بنیادیں بتلاتے ہیں، جن پر پالیسیاں بنتی ہیں، بجٹ بنتے ہیں، عمل درآمد ہوتا ہے، مالیاتی سوسائٹی کے تقاضے تکمیل پذیر ہوتے ہیں، اُن کے پیچھے فکر وفلسفہ کون سا ہے؟

آج ہمیں اپنی سوچ کی جانچ پڑتال کی ضرورت ہے کہ غلامی کے اثرات ہمارے دل ودماغ پر قابض تو نہیں ہو چکے؟ بظاہر ہمارا جسم اس دھرتی کے باسیوں کا ہے، بظاہر ہم مسلمان ہیں، لیکن ہمارے سوچنے، بولنے اور ہمارے معاشی فیصلے کرنے کا انداز، ہمارے سیاسی رائے قائم کرنے اور اجتماعی تقاضوں کی تکمیل کا عمل ہمارا نہیں، اغیار کا ہے۔ جن قوموں کا سیاسی نظام غیر مستحکم ہو، دوسروں کی ڈکٹیشن پر چلتا ہو، اس کا اپنا اجتماعی کردار نہ ہو۔ قومی تقاضے سیاسی حوالے سے پیش نظر نہ ہوں، حکومتی اہلیت اور صلاحیت مفقود ہو چکی ہو، وہ زوال پذیر معاشرہ ہے۔ اس کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں۔ اسلام کا نام استعمال کر کے وہ خواہ کتنے ہی نعرے لگائیں، پارٹیاں بنائیں، لیکن سوسائٹی کا مجموعی نظام اگر مستحکم بنیادوں پر اپنی جغرافیائی حدود میں بسنے والے انسانوں کی جان، مال، عزت آبرو کا تحفظ فراہم کرنے میں ناکام ہو، تو گویا کہ اُس نے اسلام کے اس اجتماعی تقاضے کو بھی پس پشت ڈال دیا۔ اسلام اپنی عزت، اپنی شان، اپنا وقار، اپنی شناخت، اپنے سیاسی نظام کے ذریعے سے قائم کرتا ہے۔ اور یہ عمل اتنی اہمیت کا حامل ہے کہ دنیا میں آنے والے ہر نبیؑ نے اپنی اپنی قوم کی سیاست کی۔ اس کے سیاسی تقاضوں کی تکمیل کے لیے کردار ادا کیا۔ قومی اور سیاسی تقاضے سوسائٹی کے اجتماعی تقاضوں میں سب سے زیادہ اہمیت رکھتے ہیں۔ اسی لیے نبی اکرمؐ نے فرمایا: گزشتہ انبیاؑ میں ہر نبیؑ اپنی قوم کی سیاست کرتے رہے۔ اور یہ اتنا عظیم الشان کام تھا کہ ایک نبیؑ دنیا سے تشریف لے جاتے تو دوسرے نبیؑ قائم مقام بن کر آجاتے۔ گویا کہ حکومت کی اجتماعی طاقت وقوت امن وامان کی ذمہ دار بنتی ہے، قوانین پر عمل درآمد کی حکومتی رِٹ رکھتی ہے، سسٹم کو کنٹرول کرتی ہے، سماج دشمن عناصر کا مقابلہ کرتی ہے، چوروں، ڈاکوؤں، قاتلوں، لٹیروں کے مقابلے کی حکمتِ عملی بناتی ہے، اُن کی حوصلہ شکنی کرتی ہے، انھیں سوسائٹی میں قرار واقعی سزا دے کر انسانیت کے بنیادی انسانی تقاضوں کی تکمیل کی راہ ہموار کرتی ہے۔

آج ہم سب عذاب میں مبتلا ہیں، مہنگائی، غربت، بدامنی، قتل وغارت گری، فرقہ واریت، محض گروہی بنیادوں پر علمی مخاصمات سوسائٹی پر مسلط ہیں، اس کی وجہ یہی ہے کہ ہم نے اجتماعی تقاضوں کے تناظر میں چیزوں کو سوچنے، پرکھنے، رائے قائم کرنے اور اس حوالے سے جدوجہد اور کوشش کرنے کا طریقہ اور اصول چھوڑ دیا۔ اس غلامی، مصیبت اور عذاب کے ماحول سے نکلنا چاہتے ہیں تو ہمیں سچائی کی بنیاد پر، اپنے گردوپیش میں اجتماعیت کے تقاضوں کا جائزہ لینا ہے۔ اور اس کی بنیاد پر ہمیں ایک اجتماعی جدوجہد اور کوشش کرنی ہے، جو دنیا میں بھی ہمارے لیے اجتماعی ترقی اور فلاح و بہبود کا باعث بنے اور آخرت کی ترقی اور کامیابی کا بھی ذریعہ بنے۔

www.rahimia.org

بچیوں کا کالم — چوہدری افضل حق رحمۃ اللہ علیہ

تعلیم اور صحت کے بغیر خدمت ناممکن ہے

(چوہدری افضل حق آزادی کے عظیم رہنما تھے۔ اپنی قوم کی تعلیم و تربیت اور اَخلاقی معیار کی بلندی ہمیشہ ان کے پیش نظر رہی۔ ذیل میں ان کے اُن خطوط کی تلخیص شائع کی جارہی ہے، جو اُنھوں نے 1939ء میں راولپنڈی جیل سے اپنے بچوں کے نام لکھے۔ دراصل ان کے مخاطب قوم کے ہر دور کے نونہال ہیں۔ مدیر)

بلقیس بی بی۔ السلام علیکم

تمھارے دو خط ملے اور روپے بھی۔ دیکھو بیٹی! جی لگا کر پڑھنا چاہیے، لیکن نتیجہ کا فکر نہ کرنا چاہیے۔ جو بچے بچیاں اپنا کام وقت پر اور محنت سے کریں، انھیں پھر فکر کیوں ہو۔ میں تو کہتا ہوں کہ بچے شوق سے پڑھیں۔ اگر کسی وجہ سے ناکامیاب بھی ہوجائیں تو انھیں غم نہ کرنا چاہیے۔ یہ نہ ہو کہ سارا سال تو کتاب کھول کر نہ دیکھی، پھر فکر سے رات دن نمازوں پر زور دیا اور دعائیں مانگنے لگے۔ پیاری بیٹی! ہم خدا کا کام کرنے کو پیدا ہوئے ہیں۔ خدا ہمارا نوکر نہیں کہ ہم تو ہاتھ پاؤں نہ ہلائیں اور وہ ہمیں امتحانوں میں پاس کرتا رہے اور ہر کام سنوارتا رہے۔ اول خدا سے کام کرنے اور محنت اٹھانے کی توفیق مانگنی چاہیے۔ کام میں پوری محنت کے بعد خدا سے رحم کی اُمید بھی کرنا چاہیے۔ لوگ خود کام نہیں کرتے اور خدا سے دعا مانگتے ہیں کہ اے خدا میرا کام تُو کردے!!؟ یہ غلط اور بے نتیجہ بات ہے۔

پیارے بچو! یہ مئی کا مہینہ ہے۔ یہاں کل رات پہلی بار باہر نکل کر سوئے۔ باہر سونے کو جی ترس گیا تھا۔ آہاہا، کیسی تاروں بھری رات تھی۔ نیلے آسمان سے لاکھوں چھوٹے چھوٹے چراغ لٹک رہے تھے۔ کیا صاف ہوا تھی۔ لاہور شہر میں ایسی عمدہ ہوا کہاں۔ ہاں! لاہور میں ان دنوں تو سخت گرمی ہوگی۔ یہاں اب تک لحاف اوڑھ کر اندر سوتے رہے ہیں۔ راولپنڈی کا موسم بھی عجیب رہا ہے۔ موسم کیا ہوتا ہے، چھوٹی عمر کا بچہ ہے کبھی ہنستا ہے، کبھی رونے لگتا ہے۔ یہاں پانی برسنے اور کھل جانے کا کوئی اعتبار نہیں۔ ابھی ابھی گرمی ہے۔ تھوڑی دیر بعد سرد ہوائیں چلنے لگتی ہیں۔ اس لیے میں احتیاط کے طور پر گرم لباس پہنتا ہوں، گرمی ذرا تیز ہوجائے تو ٹھنڈے کپڑے پہنوں۔

بھئی! اس دفعہ شمس الحق کو کہو کہ وہ خط کا جواب لکھے۔ ہر کام محنت سے آتا ہے، وہ اپنے بدخط کی وجہ سے شرماتا ہے۔ اگر وہ محنت کر کے توجہ سے نہ لکھے گا تو اس کی لکھائی اچھی نہ ہوگی۔ معروف بی بی! مجھے رہ رہ کر تمھاری صحت کا خیال آتا ہے۔ اس لیے کہ بچوں کی صحت اور تعلیم کا خیال رکھنا ماں باپ کا اوّلین فرض ہے، لیکن بچوں کو ماں باپ کا صرف اتنا ہی خیال رکھنا چاہیے کہ وہ جسم اور علم کے لحاظ سے بہتر ہوں۔ ماں باپ کو بچوں کی محبت قدرتی اور ضروری ہے، لیکن بچوں کو ماں باپ کی خدمت ضروری ہے، وہ بغیر صحت کے ممکن نہیں۔

خواتین کا کالم — مولانا عبداللہ عابد سندھی، شکارپور

ازدواجی زندگی میں عورت کی ذمہ داری

عورت اور مرد دونوں انسانی سماج کے دو اہم عنصر ہیں، جن کی فکری قوتوں سے ارتقا کے مراحل طے ہوتے ہیں۔ فطرت نے انھیں مختلف قسم کی صلاحیتوں نے نوازا ہے۔ اگر مرد میں سربراہی کی صلاحیت ہے تو عورت اس کی ملکہ ہے۔ عربی مقولہ ہے: ”ھی ربّة البیت.“ (عورت گھر کی مالکن ہے۔) اور یہ اعزاز اسے اپنے گھر کے پورے پرداخت (پرورش) کرنے کی وجہ سے حاصل ہوا ہے۔ چناں چہ ازدواجی زندگی کو پائیدار بنانے میں عورت کی ذمہ داری بنیادی حیثیت رکھتی ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا واضح ارشاد ہے: ”والمرأة راعية علىٰ اهل بيت زوجها و ولده و هي مسئولة عنهم.“ (بخاری، کتاب الاحکام) یعنی عورت اپنے شوہر کے گھر والوں اور اس کی اولاد کی نگران ہے۔ اور ان کے متعلق اس سے بازپُرس ہوگی۔

گھر کے اندر عورت کے نگران ہونے کا مطلب یہ ہے کہ جو افراد اس کے زیر اثر ہیں، اس کا فرض ہے کہ ان کے حقوق اور مفادات کی نگہداشت کرے۔ ان کو راہِ راست پر چلائے اور بے راہ روی سے باز رکھے۔ اور ان کے نفع و نقصان کی اس طرح نگرانی کرے، جس طرح ایک چرواہا جنگل میں بھیڑوں کی کرتا ہے۔ عورت کا فرض یہیں ختم نہیں ہوتا، بلکہ وہ اس دولت اور سامان کی بھی محافظ بنائی گئی ہے، جو شوہر نے اس کے استعمال میں دیا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے درمیان امورِ خانہ داری کی تقسیم اس طرح فرمائی تھی کہ حضرت فاطمہؓ اندرونی خدمات اور حضرت علیؓ باہر کے کام انجام دیں گے۔ عورت کے یہ فرائض فکر و عمل کی آزادی کے ساتھ اپنی صواب دید کے مطابق امور سرانجام دینے کی آزادی کے بھی ہیں۔ ایک مرتبہ ہند بنت عتبہؓ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے اپنے شوہر ابوسفیانؓ کی گھر کے اخراجات کے حوالے سے شکایت کی تو آپؐ نے فرمایا: ”عرفِ عام کے مطابق تم اپنی اور اپنی اولاد کے لیے حسبِ ضرورت اپنے شوہر کی دولت خرچ کرسکتی ہو۔“ (بخاری، کتاب الانفاق) گھر کی زندگی کو خوش گوار بنانے میں مرد پر یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ عورت کی تمام بنیادی ضروریات کو پورا کرتے ہوئے اس سے محبت اور احترام کا رویہ روا رکھے۔ ازدواجی زندگی میں عورت کی صلاحیتوں پر دین اسلام کے اعتماد کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ وہ اس کو اولاد کے سن شعور کو پہنچنے تک ان کی پرورش اور نگہداشت کے لیے مردوں سے زیادہ اہل اور موزوں سمجھتا ہے۔

ایک صحابیؓ نے اپنی بیوی کو طلاق دے دی۔ دونوں کا ایک بچہ بھی تھا اور وہ بچے کو اپنے پاس رکھنا چاہتے تھے، لیکن بچے کی ماں نے حضورؐ سے اس کے خلاف شکایت کی۔ تو آپؐ نے فرمایا: ”تُو اس کی زیادہ حق دار ہے۔“ مطلب یہ ہے کہ ماں، باپ سے زیادہ بچے کی حق دار ہے۔ اور وہ امورِ خانہ داری مرد سے بہتر طور پر ادا کرسکتی ہے۔ خانہ داری کے معاملات میں عورت کو مرد پر مقدم کرنے کی وجہ یہ ہے کہ وہ نہ صرف بچوں کی تربیت اور پرورش بہتر طریقے پر انجام دے سکتی ہے، بلکہ زندگی کے جس دائرے میں بھی اس سے سوسائٹی کے لیے جو بھی خدمات لی جائیں، وہ مفید اور کارآمد ہوتی ہیں۔

www.rahimia.org

مفتی عبدالقدیر، چشتیاں

حضرت نانوتویؒ کے بے مثال کمالِ علم کا سبب

حضرت (مولانا محمد قاسم) نانوتویؒ جب دیانند سرسوتی کے مقابلے میں شہر روڑکی تشریف لے گئے تو علاوہ اَور (دیگر) خدام کے منشی نہال احمد دیوبندی اور شاہ جی عاشق علی بھی ہمراہ تھے۔ منشی نہال احمد کو (جو نہایت ذکی تھے) دیانند کے پاس شرائطِ مناظرہ طے کرنے کے لیے بھیجا گیا۔ منشی صاحب اس کی قیام گاہ پر موجود تھے کہ کھانے کا وقت آ گیا اور اس کے لیے کھانا لایا گیا۔ کئی بڑی بڑی تھالیں پوڑیوں کی تھیں اور سیروں مٹھائی تھی۔ جس کو یہ کئی آدمیوں کا کھانا سمجھے۔ مگر وہ اس اکیلے کے لیے آیا تھا اور اسی تنہا نے سب تھالیں صاف کر دیں۔

منشی صاحب نے اپنی ایک بے تکلف مجلس میں اس واقعے کا ذکر کرتے ہوئے بطورِ مزاح کہا کہ اگر ہمارے مولانا سے علم و فضل میں مناظرہ ہوا تو انشاء اللہ مولانا غالب آئیں گے ہی، لیکن اگر کہیں کھانے میں مناظرے کی ٹھن گئی تو کیا ہوگا؟ کیوں کہ حضرت نہایت قلیل الاکل (کم کھانے والے) تھے۔ یہ مقولہ حضرت (نانوتویؒ) تک پہنچا تو منشی نہال احمد صاحب بلائے گئے۔ حضرت (نانوتویؒ) قیام گاہ کی چوکھٹ پکڑے ہوئے کھڑے تھے کہ یہ حاضر ہوئے اور دل میں سمجھے ہوئے تھے کہ دیکھئے اب کیا سوال ہوگا اور کہیں وہی بات پہنچ گئی ہے تو دیکھئے کیسی ڈانٹ پڑے گی۔ حضرت (نانوتویؒ) نے فرمایا کہ: ''منشی جی! تم نے کیا کہا تھا؟ میں تمھاری زبان سے سننا چاہتا ہوں۔'' انھوں نے وہی مقولہ دبی زبان سے دہرایا۔ فرمایا کہ: ''اس کے دو جواب ہیں: ایک یہ کہ اگر کھانے میں مناظرہ ہوگا تو تم ساتھ ہو۔ اب دوسری بات جو حقیقت ہے، وہ سنو۔ تمھارے دل میں یہ سوال پیدا کیوں ہوا؟ اور یہ سوال کیوں نہ پیدا ہوا کہ اگر ترک اکل (کھانا چھوڑنے) اور فاقوں میں مناظرہ ہوگا تو کون غالب رہے گا۔ تم جانتے ہو کہ کھانا کس کی صفت ہے؟ بہائم اور جانوروں کی۔ اور نہ کھانا کس کی صفت ہے؟ حق تعالیٰ اور ملائکہ کی۔ تو تم مجھ سے مناظرہ جہالت میں کرانا چاہتے ہو۔ مناظرہ علم میں ہوتا ہے یا جہل میں؟ اگر اسی میں مناظرہ ہوا تو کسی بھینسے یا ہاتھی کو لا کر دیانند کے مقابلے میں کھڑا کر دینا کہ کون زیادہ کھاتا ہے۔''

حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ ایک متبحر ولی اللّٰہی عالم ہیں۔ ولی اللّٰہی فلسفے میں انسانیت کی حیوانیت اور ملکیت سے ترکیب اور امتزاج پر خوب روشنی ڈالی گئی ہے۔ اور انسانیت کا کمال حیوانی تقاضوں پر عقلی اور ملکی تقاضوں کے مستقل غلبے کو قرار دیا ہے۔ یہاں حضرتؒ نے اسی حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے۔ اس سے دنیا پرستوں کے بارے میں آیتِ مبارکہ کہ: ''وہ اس طرح کھاتے ہیں، جیسے جانور کھاتے ہیں۔'' (12:47) نیز حدیثِ نبویؐ کہ: ''مؤمن ایک آنت میں کھاتا ہے اور کافر سات آنتوں میں۔'' (بخاری شریف) کی تفسیر خوب واضح ہوگئی۔ اس میں یہ رہنمائی ہے کہ ایک مؤمن کا نصب العین محض کھانا پینا اور عیاشی کرنا نہیں ہونا چاہیے، بلکہ نظامِ ظلم کا خاتمہ کر کے عادلانہ اَخلاق کا سسٹم قائم کرنا ہونا چاہیے، تاکہ ہماری آخرت بہتر ہو سکے۔

وسیم اعجاز، کراچی

مخدوم معظم محمد معین محدث ٹھٹھویؒ

حضرت الامام شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے اپنے پروگرام کی تدوین کے ساتھ ساتھ رفقا کی مرکزی جماعت بھی تیار کی، جو تعلیم و ارشاد کے ذریعے اس انقلابی تحریک کی اشاعت کرتی رہی۔ انھوں نے اطرافِ ملک میں اس مرکزی جمعیت کی شاخیں قائم کرائیں۔ نجیب آباد کا مدرسہ، رائے بریلی میں دائرہ تکیہ شاہ علم اللہؒ اور سندھ میں ملا محمد معینؒ کا مدرسہ حکیم الہند امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی مرکزی تحریک کے مراکز تھے۔ ٹھٹھہ اس دور میں سندھ کا دارالحکومت تھا۔ ملک کے اس اہم مرکز میں امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے قیادت کے فرائض اپنے بااعتماد خلیفہ و شاگرد مخدوم محمد معین ٹھٹھویؒ کے سپرد کیے۔

مخدوم محمد معین ٹھٹھویؒ کی ولادت 1093ھ/1682ء میں بمقام ٹھٹھہ میں ہوئی۔ ان کے والدِ گرامی کا نام محمد امین اور دادا کا نام شیخ طالب اللہ تھا۔ ابتدائی تعلیم ٹھٹھہ میں حاصل کی۔ امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی تدریس و تعلیم اور ان کی علمیت کا شُہرہ سن کر دہلی روانہ ہو گئے اور شاہ صاحبؒ کے پاس کئی سال رہے اور ان سے فلسفہ، الٰہیات، حدیث اور دیگر علوم کی تحصیل کی۔

حضرت الامام شاہ ولی اللہ دہلویؒ جب سفرِ حج کے دوران 1143ھ میں ٹھٹھہ میں مدرسہ ملا محمد معینؒ میں قیام پذیر ہوئے، اس سفر کے احوال میں امام شاہ ولی اللہؒ کے رفیقِ خاص مولانا محمد عاشقؒ، محمد معین ٹھٹھویؒ کی خلافت کے واقعے کو اس انداز میں تحریر فرماتے ہیں: ''مخدوم محمد معینؒ نے حضرت اقدس (شاہ ولی اللہ دہلویؒ) کی صحبت کو غنیمتِ کبریٰ سمجھا اور آپؒ کے جمالِ باکمال کے گرویدہ ہو گئے۔ اور انھوں نے آپؒ سے بہت زیادہ فیض حاصل کیا اور اجازت و خلافت کا شرف حاصل کیا۔'' مخدوم محمد معینؒ ہر دل عزیز شخصیت تھے۔ ان کی خدمت میں امیر اور غریب سب ہی آتے تھے۔ امرا و اہلِ دل کا اکثر جمگھٹا رہتا اور وہ آپ کے پاس حاضری کو اپنے لیے باعثِ فخر و مباہات سمجھتے تھے۔ مخدوم صاحبؒ فارسی کے قادرالکلام شاعر بھی تھے۔ فارسی میں تسلیم تخلص کرتے تھے۔

سولہویں تا اٹھارہویں صدی عیسوی میں یوں تو صرف ٹھٹھہ شہر میں بے شمار مدارس موجود تھے، لیکن مخدوم صاحبؒ کا ٹھٹھہ میں قائم کیا ہوا مدرسہ ''مدرسہ ملا مخدوم محمد معینؒ'' کے نام سے جانا جاتا تھا۔ امام انقلاب حضرت مولانا عبیداللہ سندھیؒ نے اپنی کتاب ''شاہ ولی اللہؒ اور ان کی سیاسی تحریک'' میں اس مدرسے کو سندھ میں ولی اللّٰہی تحریک کے ایک مرکز کے طور پر لکھا ہے۔ ابتدائی دور میں اس تحریک کا بنیادی مقصد چوں کہ ولی اللّٰہی اصول و نظریات کی اشاعت ایک طرف صوفیا اور علما میں اور دوسری طرف امرا اور سردارانِ سلطنت میں کام کرنا تھا، لہٰذا تاریخ شاہد ہے کہ مخدوم صاحبؒ نے اس مقصد کو ہر ممکن حد تک پورا کیا ہے۔ اور ایسے رجالِ کار تیار کیے، جنھوں نے دنیا میں اپنا نام پیدا کیا اور تاریخ میں نمایاں کارنامے سرانجام دیے۔ (بقیہ صفحہ 11 پر)

www.ahlehaq.org

بیادِ شیخ

دورِ حاضر کی عبقری شخصیت، مجددِ عصر، داعی انقلاب

حضرت اقدس مولانا شاہ سعید احمد رائے پوریؒ

ڈاکٹر تاج افسر، اسلام آباد

تاریخ انسانی کا بطن ایسے کئی افراد سے بھرا پڑا ہے، جو اپنے دور کے رہنما، نبض شناس اور عظیم الشان حکیم گزرے ہیں۔ آج ہم جس عبقری شخصیت کا ذکر کرنے چلے ہیں، وہ بلا شبہ دورِ حاضر کی غیر معمولی عزم و استقلال کی حامل ہے۔ تین سال پہلے ستمبر میں حضرت اقدس مولانا شاہ سعید احمد رائے پوریؒ کی رحلت کو آج تک ان کے قدر شناس بھولے نہیں ہیں۔ ہر گزرتے لمحے کے ساتھ ان کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔

حضرت اقدس رائے پوریؒ کے زندگی کے کئی پہلو ہیں اور ہر پہلو کے اعتبار سے ان کا کوئی ثانی نہیں۔ ایشیا کو جب عالمی قوتیں میدانِ جنگ بنانے کے لیے پَرتول رہی تھیں، عالمی کھلاڑی آستینیں چڑھا رہے تھے اور مفادات کی جنگ کو مذہبی چھتری فراہم کر رہے تھے، جس کے نتیجے میں بلا استثنا ''مذہب کے نمائندوں'' نے اپنے نوجوانوں کی بھرتی کر کے ڈالر، پاؤنڈ اور ریال کی ''مضاربت'' کی اور جس کے نتیجے میں آج عالمی امن داؤ پر لگا ہوا ہے، دُنیا دہشت گردی اور قتل و غارت کی آماج گاہ ہے، نفرتوں نے وطن عزیز پاکستان کی جڑیں کھوکھلی کر دی ہیں۔

حضرت رائے پوریؒ ان خطرات سے اپنی قوم کے ہونہاروں کو بیدار کر کے اَسلاف کا بھولا ہوا سبق یاد دلا رہے تھے اور دور کے عالمی کھلاڑیوں کا تعارف کرا کر اپنے قومی بچاؤ کی تدبیریں سمجھا رہے تھے۔ اپنے مقدس دین اور اَقدار کی تعلیمات سکھا رہے تھے۔ دوسروں کے مفادات کی دلالی سے بچنے کی تلقین کر رہے تھے۔ مقابلے میں دین فروش، دُنیا پرست اور عالمی مفادات کو دین کا نام دینے والے' حضرتؒ کے خلاف الزام تراشی، فتویٰ بازی، کفر و اِلحاد کی پھبتیاں کس رہے تھے۔ بدلتے ہوئے حالات نے اس عظیم رہنما کی علم و عمل اور حالات پر گہری نظر کی تصدیق کر دی اور فتویٰ باز، الزام تراش، مذہب فروش خود بجا طور اس وقت دہشت گرد قرار دیے جا رہے ہیں۔

حضرت اقدس کا دوسرا غیر معمولی پہلو اپنے اکابر کی دی ہوئی تعلیمات اور نظریات پر رُسوخ اور اعتماد ہے۔ ہدایت کا دراصل یہی مفہوم ہے کہ انسان اسلاف کی باتوں کو خوب سمجھ کر اپنے اندر جذب کرے اور اس سلسلے میں اسلافِ اُمت پر غیر متزلزل اعتماد کرے۔ وراثت علم و نظریہ آزادی و حرّیت حضرت اقدسؒ نے اپنے اندر ایسا جذب کیا کہ نوجوانوں سے محبت، اُن کو نظریات سکھانے اور محبتیں بانٹنے کا جذبہ، ان کی طبیعتِ ثانیہ بن گیا۔ تقریباً 1950ء سے لے کر 2012ء تک کا یہ طویل عرصہ ان کی اَنتھک جدوجہد سے عبارت ہے۔ اس کے مقابلے میں کسی دباؤ یا لالچ سے بے غرض ہو کر اپنا مشن جاری رکھا۔ وہ دباؤ چاہے خاندان کا ہو، سسٹم کی نمائندہ خانقاہوں یا مدارس و علمائے سُو کا ہو، اپنوں کا ہو یا غیروں کا ہو، اور چاہے حالات کے اُتار چڑھاؤ کا ہو، بغیر کسی کی پرواہ کیے اپنے مشن پر کام جاری رکھا۔

ایسے ہی حضرت اقدس شاہ سعید احمد رائے پوریؒ طوفانوں کے سامنے جبل استقامت تھے۔ تقسیم ہند سے جس نئے دور کا آغاز ہوا، آزادی کی 200 سالہ جدوجہد کو جس انداز سے پامال کیا گیا اور اس کی جگہ خطے میں دولت برانڈ اسلام متعارف کرانے کے لیے تمام تر ملکی وسائل و ادارے استعمال کیے گئے، تحریکِ بالاکوٹ، تحریکِ آزادیٔ ہند، تحریکِ دیوبند، تحریکِ ریشمی رومال اور اس کے بعد کی اَنتھک سیاسی جدوجہد کو حرفِ غلط کی طرح صفحۂ ہستی سے مٹانے کی کوشش کی گئی۔ مذہبی اور عصری اداروں سے اس کا نام و نشان تک مٹا دیا گیا۔ ایسے حالات میں حضرت اقدسؒ نے بے سروسامانی کے عالم میں آزادی و حریت اور دین کے سچے نمائندوں کے تعارف کا جو چراغ جلایا، وہ انھی کا حصہ ہے۔ گویا دورِ حاضر میں حضرتؒ کی اکیلی شخصیت پوری ولی اللّٰہی جماعت ہے۔ یہی ولایتِ نبوت ہے۔ تاریخ انبیاؑ پر غور کیا جائے تو اولوالعزم انبیاؑ میں ہر ایک نے ظلمتوں میں اکیلے ہی چراغ جلائے، جن کی روشنی چار سُو پھیلی۔

حضرتؒ کی شخصیت کا ایک نمایاں پہلو یہ بھی ہے کہ تنہائی کے باوجود اور سامنے کثیر الجہتی میدان کے باوصف، شریعت و طریقت اور سیاست کی جامعیت میں توازن قائم رکھا۔ حالات کے اُتار چڑھاؤ، اُن کے اس توازن کو مضطرب نہ کر سکے۔ آپ کی مسلسل اور جامع جدوجہد کے نتیجے میں آپ کا لگا ہوا پودا آج شجرہ مثمرہ بن چکا ہے۔

آپؒ کا نمایاں پہلو یہ بھی ہے کہ اکابرِ حق اور آئندہ نسلوں کے درمیان حائل ہونے اور اپنی شخصیت کا بت کھڑا کرنے کی بجائے اَسلاف کی امانت اگلی نسلوں تک منتقل کرنے میں اپنے آپ کو مٹائے رکھا، تاکہ نوجوان نسل پوری آزادی اور شعور کے ساتھ حالات کا جائزہ لے۔ نظریات پر غور کرے، تجزیہ کرے اور شعوری بنیادوں پر اپنے بزرگوں کی سچائی تسلیم کرے۔

حضرت رائے پوری رابعؒ کی ذات کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ آپ نے اکابر کا فیض نوجوانوں میں منتقل کر کے ایک مضبوط اجتماعیت پیدا کی، جو آج اپنا مشن جاری رکھے ہوئے ترقی کے راستے پر گامزن ہے۔ قرآن حکیم نے نبی اکرم ﷺ کی صحبت سے تیار ہونے والی جماعتِ صحابہؓ کو ایک پودے سے تشبیہ دی ہے کہ جیسے ایک کھیتی اپنی کونپل نکالتی ہے، مضبوط ہو کر اپنے تنے پر کھڑی ہوتی ہے، جسے دیکھ کر کسان خوش ہوتا ہے اور حسد کرنے والا اُس کا دشمن' دیکھ کر جلتا ہے۔ آج کے دور میں حضرت اقدس مولانا شاہ سعید احمد رائے پوری نوّر اللہ مرقدہٗ نے نبوت کی اس سنت کا احیا کر دیا۔

مختصر یہ ہے کہ حدیث پاک کے مصداق کے مطابق حضرت اقدس رائے پوری رابعؒ نے ''عُلماءِ اُمَّتی کَاَ نْبِیاءِ بَنی اِسْرائیلُ'' (میری اُمت کے علمائے (ربانیین) انبیائے بنی اسرائیلؑ کی طرح کام کریں گے۔) کا نمونہ ہمارے سامنے قائم کر دیا۔

چناں چہ جیسے بنی اسرائیل کے انبیاؑ نے اپنی قوم کی سیاست کی، انھیں زوال سے نکال کر عروج دیا، اسی طرح حضرت اقدس رائے پوریؒ نے ایک عالم ربانی کا کردار ادا کرتے ہوئے اس قوم کی زوال پذیر سیاست کو غلبہ دین کے نظریے کے ساتھ جرأت اور ہمت عطا کی اور زوال سے نکلنے کی حکمتِ عملی سکھائی۔ آپؒ نے فرمایا تھا: ''انبیائے بنی اسرائیلؑ میں جب کوئی نبیؑ دنیا سے تشریف لے جاتے تو دوسرے نبیؑ ان کے خلیفہ بن کر کردار ادا کرتے۔ خبردار! میرے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا، بلکہ میرے بعد میرے خلفا ہوں گے۔'' جو یقیناً انبیائے بنی اسرائیلؑ کا سا کردار ادا کریں گے۔ یہی وہ علمائے اُمت ہیں، جو بنی اسرائیل کے انبیاؑ کی طرح کردار ادا کرنے والے ہیں۔ بلاشبہ اس برعظیم پاک و ہند میں حضرت مجدد الف ثانی قدس سرہٗ سے لے کر ولی اللّٰہی سلسلے کے علمائے ربانیین نے انبیائے بنی اسرائیلؑ کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے اس قوم کو زوال سے نکالنے کے لیے بنیادی اور اہم کردار ادا کیا۔ آزادی اور حریت کا درس دیا۔ سیاسی غلامی سے نجات دلانے کے لیے کردار ادا کیا۔

حضرت اقدس رائے پوریؒ اسی جماعت کے ایک اہم ترین فرد تھے۔ آج حضرت اقدسؒ ہم میں نہیں، لیکن اُن کی قائم کردہ اجتماعیت، اُن کا فیض اور اُن کا مشن روز افزوں ترقی کر رہا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ حضرت اقدسؒ کی جدوجہد اور کردار نے ہمیں دورِ حاضر کی ظلمتوں میں انبیاؑ کی محنت سے روشناس کرایا۔ صحابہؓ، تابعین، تبع تابعین، مجددین اُمت اور بالخصوص ولی اللّٰہی جماعت کا نمونہ ہمارے سامنے پیش کر دیا۔ اس میں حضرت اقدسؒ کا کوئی ثانی نہیں۔ اللہ تعالیٰ حضرت اقدس مولانا شاہ سعید احمد رائے پوریؒ کے ذریعے سے حاصل ہونے والے اکابر کے فیض کی ہمیں قدردانی اور علمی، عقلی اور روحانی ترقی نصیب فرمائے۔ آمین۔ آج سے تین سال پہلے رمضان المبارک اور عیدالفطر کے بعد 26 ستمبر 2012ء کو ہوئی۔ حضرت رائے پوری رابعؒ چند دن بیمار رہ کر واصلِ حق ہو گئے۔

آپؒ کے وصال سے ایک ہفتہ پہلے راقم نے خواب دیکھا کہ حضرت اقدس رائے پوری رابعؒ ہمارے گھر تشریف لائے۔ ان کے ساتھ حضرت اقدس مفتی عبدالخالق آزاد رائے پوری دامت برکاتہم اور چند دیگر مقامی احباب ہیں۔ حالت یہ ہے کہ ہمارے گھر کی چھت نہیں ہے، جیسے کسی طوفان وغیرہ سے اُڑ گئی ہو۔ میں اس حالت میں پریشان بھی ہوں کہ حضرت اقدس کی شایانِ شان ضیافت نہ ہو سکے گی۔ اسی سوچ میں مَیں نے عرض کیا کہ: حضرت! کھانا تیار ہے۔ تو حضرتؒ نے ارشاد فرمایا کہ: ''بھئی! ہمارا کھانا کہیں دوسری جگہ ہے، وہیں کھائیں گے۔'' کیا معلوم تھا کہ ہم سب کے سَروں سے حضرت اقدسؒ کی شفقت کی چھت اُٹھ رہی ہے اور حضرت اقدسؒ کے کھانے کا اہتمام اولیا اور مقربین کے ہاں ہو چکا ہے۔

اللہ تعالیٰ حضرت اقدس مولانا شاہ سعید احمد رائے پوریؒ کے درجات بلند فرمائے اور ہمیں ان کی طرف سے سونپی ہوئی امانت نسل نو تک پہنچانے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین!

بقیہ: عظمت کے مینار

اس مدرسے میں آپؒ مختلف علوم کی تعلیم دیتے تھے اور طالب علموں کے اخراجات آپؒ خود برداشت کرتے تھے۔ اس مدرسے کی بدولت سندھ میں علم و فضل کو کافی ترقی ہوئی۔ یہی وجہ تھی کہ امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے اپنی تعلیمات کی ترویج و اشاعت کے لیے آپؒ کے مدرسے کو منتخب کیا۔ یہاں کے تربیت یافتہ طلبا پورے ملک میں پھیلے۔ انھوں نے جابجا مراکز قائم کر کے علوم کی اشاعت میں غیر معمولی حصہ لیا۔ مخدوم محمد معینؒ کے شاگردوں میں میر نجم الدین عزلتؒ، مولوی محمد صادقؒ، علامہ محمد حیات سندھیؒ، جعفر شیرازیؒ، شرف الدین علیؒ اور میر مرتضیٰ سیوستانیؒ مشہور ہیں۔

انسانیت دوستی اور معاشرتی ارتقا کا تصور مخدوم صاحبؒ کی تعلیمات کا اہم جز و تھا۔ چوں کہ شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ کا آپؒ سے عقیدت، محبت اور دوستی کا تعلق تھا اور ان نظریات سے بھٹائی صاحبؒ کا متاثر ہونا لازمی امر تھا۔ یہی وجہ ہے کہ امام عبیداللہ سندھیؒ کے شاگردِ خاص حضرت مولانا غلام مصطفیٰ قاسمیؒ فرماتے ہیں کہ: ''شاہ عبداللطیف بھٹائی کا کلام شاہ ولی اللہؒ کے نظریات سے متاثر تھا۔ ''شاہ جو رسالو'' کے پہلے دو ابواب سُر کلیان اور سُر ایمن کلیان کو سمجھنے کے لیے مخدوم معین ٹھٹھویؒ سے آپؒ کی دوستی کا تعلق اور شاہ ولی اللہؒ کا انسانیت دوستی کا فلسفہ سمجھنا ضروری ہے۔'' اس کے بغیر بھٹائی صاحبؒ کی شاعری کی حقیقت سمجھنا مشکل ہے، لیکن افسوس! کہ آنے والے دنوں میں کی شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ تعلیمات کو اس انداز سے نہیں سمجھا گیا۔

مخدوم محمد معین ٹھٹھویؒ درس و تدریس کے ساتھ ساتھ تصنیف و تالیف سے بھی خاص شغف رکھتے تھے۔ انھوں نے ایک اندازے کے مطابق 90 سے زائد کتب تصنیف کی ہیں۔ ''دراسات اللّبیب بالأسوة الحسنة بالحبیب'' ان کی ایک عمدہ کتاب ہے، جو عراق و یمن میں بہت مقبول ہے۔ اس کتاب کی مناسبت سے ان کو ''صاحب الدراسات'' کا لقب بھی دیا گیا۔ ان کا وصال 1161ھ/1748ء میں ٹھٹھہ میں ہوا۔ ان کی تجہیز و تکفین کے بعد شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ ٹھٹھہ سے رخصت ہونے لگے تو فرمایا: ''ٹھٹھہ میں ہمارا آنا صرف اس (عزیز دوست) کے لیے تھا، آج یہ بھی ختم ہوا۔''

حضرت الامام شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے اپنے ایک خط میں مخدوم محمد معین ٹھٹھویؒ کے وصال پر تعزیت کا اظہار ان الفاظ میں کیا ہے: ''مخدومِ معظم کا اس جہانِ فانی سے انتقال کر جانا ایسا حادثہ ہے کہ فرطِ غم سے اپنے گریبان چاک اور لباس کبودی (نیلا ماتمی) کر لیں اور آہ و بکا کو انتہائی درجے پر پہنچا دیں۔ آخر کار تقدیر واجب التحقیق اور عادۃ اللہ کے جاری ہونے پر نظر کرنا، جو کہ اہلِ کمال حتیٰ کہ انبیا و مرسلین کے انتقال و وفات سے بھی متعلق ہے، اس آتشِ غم پر پانی چھڑک دیتا ہے۔''

آپؒ کا مزار ٹھٹھہ سندھ کے قدیم قبرستان مکلی میں موجود گورستان شیخ ابوالقاسمؒ میں شمال کی جانب مخدوم ابوالقاسمؒ کے پائیں میں ہے۔

www.rahimia.org

بیادِ شیخ

عاشق علی سوہو، لاڑکانہ

''امامِ انقلاب ثانی''

حضرت اقدس مولانا شاہ سعید احمد رائے پوری رحمۃ اللہ علیہ

ان کی ہر ادا سرورِ کونینؐ یاد آئے
شفیق اتنے کہ صدیق اکبرؓ یاد آئے

عدل میں وہ تصویرِ فاروقِ اعظمؓ تھے
حیا اُن کا دیکھا ذوالنورینؓ یاد آئے

حکمت و دانش بہ تصویرِ علی المرتضیٰؓ
قرآں میں تدبر عشرہ مبشرہ یاد آئے

ان کے دامن کی وسعت و جامعیت
فکر و ذکر میں ولی اللہؒ یاد آئے

غلبہ دین کی تڑپ ، عصر حاضر کی حکمت
ان کو دیکھا تو شیخ الہندؒ یاد آئے

دین کی اہمیت ، دور کا تقاضا
عمل و کردار میں امام سندھیؒ یاد آئے

'عاشق' ان کا ہر لمحہ و بسمہ
بہ خدا اکابر و اسلاف یاد آئے

آیا جو ستمبر تو 'عاجز' کو
امامِ انقلاب ثانی ، حضرت سعیدؒ یاد آئے

'عاجز' عاشق علی سوہو۔ خاک پائے درخانقاہِ رائے پور۔ لاڑکانہ
12/09/2015 بروز ہفتہ

دینی مسائل

اس صفحے پر قارئین کے سوالات کے جوابات دیے جاتے ہیں!

از جناب مولانا مفتی عبدالقدیر شعبہ دارالافتا ادارہ رحیمیہ علومِ قرآنیہ (ٹرسٹ) لاہور

سوال حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے جب مدینہ ہجرت فرمائی تو اس کے بعد انھوں نے کس پیشے کو اپنا ذریعہ روزگار بنایا؟ کیا نبوت، خلافت اور معاشی کاروبار میں کوئی تضاد ہے؟

سائل: تنویر احمد تہامی، میانوالی

جواب حدیث پاک کے مطابق کسبِ حلال فریضہ (فرض نماز) کے بعد فریضہ ہے۔ امام سرخسی محمد بن احمدؒ متوفی 483ھ نے امام محمد بن حسن شیبانیؒ کی کتاب ''الکسب'' کی شرح میں لکھا ہے کہ: ''کسب اور رزقِ حلال کی طلب انبیا و مرسلین کی سیرت اور راستہ ہے۔ چناں چہ حضرات انبیاؑ میں حضرت نوح نجّار (بڑھئی)، حضرت ادریس خیّاط (درزی)، حضرت ابراہیم بزّاز (کپڑا فروش)، حضرت داؤد زِرہ باف (زرہ بنانے والے)، حضرت سلیمان زنبیل باف (ٹوکریاں بنانے اولے) اور حضرت زکریا علیہم السلام نجّار (بڑھئی) تھے۔ نبی اکرمؐ نے مکہ کی زندگی میں گلہ بانی (بکریاں چرانا) کی، جب کہ ہجرت کے بعد بھی آپؐ نے تعلیم و تربیت اور نبوت و خلافت کی اجتماعی ذمہ داریوں کے ساتھ تجارت و زراعت جیسے کاروبار میں حصہ لیا۔ حضرت سائب بن ابی سائبؓ فرماتے ہیں کہ: ''چمڑے کے کاروبار میں نبی اکرمؐ میرے شریکِ کار تھے۔'' (ابوداؤد) نیز آپؐ نے مدینہ کے جُرف مقام میں کاشت کاری بھی اختیار فرمائی۔'' (شرح کتاب الکسب از صفحہ 71 تا 80۔ طبع بیروت) نبوت کے بعد آپ ﷺ کی اصل مشغولیت نبوت و خلافت کی ذمہ داریوں کی انجام دہی تھی۔

سوال ہبہ کی شرعی حیثیت کیا ہے؟ کیا والدین اپنی جائیداد میں سے کچھ حصہ اپنے بیٹے یا بیٹی میں سے کسی ایک کو ہبہ کر دیں تو یہ باقی اولاد کے ساتھ ناانصافی ہے؟ نیز کیا وراثت کی تقسیم کے وقت ہبہ والی جائیداد (دوکان، زمین، مکان) کو بھی اُسی طرح تقسیم کیا جائے گا، جیسے باقی جائیداد کو کیا جاتا ہے؟ یا ہبہ کو تقسیم نہیں کیا جاسکتا؟

سید احمد جواد ہمدانی، قصور

جواب ہبہ شرعاً ایک مستحسن اور سنت عمل ہے۔ آپؐ نے ارشاد فرمایا تھا: ''تھادَوا تحابُّوا۔'' (آپس میں ہدایا (تحائف) دیا کرو، اس سے باہمی محبت پیدا ہوتی ہے۔) علامہ شامیؒ نے ''کتاب الھبہ'' میں وضاحت کی ہے کہ: ''اگر بعض اولاد کو اس کی نیکی اور رُشد (صلاحیت) کی زیادتی کی وجہ سے دوسری اولاد کو چھوڑ کر کوئی چیز جائیداد وغیرہ عطیہ کی جائے تو یہ ہبہ کرنا جائز ہے۔ اگر اس پر قبضہ ہو کر ہبہ مکمل ہو گیا تو وہ اب میراث میں نہیں لوٹے گا۔''

مجلس مشاورت

حضرت مولانا مفتی عبدالقدیر (چشتیاں)
حضرت مولانا مفتی عبدالغنی قاسمی (لاہور)
حضرت مولانا مفتی محمد مختار حسن (نوشہرہ)
حضرت مولانا صاحبزادہ عبدالقادر دین پوری (بہاولنگر)
حضرت مولانا صاحبزادہ رشید احمد (ڈیرہ اسماعیل خان)
حضرت سید مطلوب علی زیدی (لاہور)
حضرت مولانا مفتی محمد اشرف عاطف (سعودی عرب)
حضرت مولانا محمد اشرف اثر (حیدرآباد)
حضرت ڈاکٹر لیاقت علی شاہ معصومی (سکھر)
حضرت حاجی محمد بلال بلوچ (قاضی احمد)
محترم ڈاکٹر عبدالرحمٰن راؤ (سرگودھا)
محترم انجینئر آفتاب احمد عباسی (کراچی)
حضرت مولانا عبداللہ عابد سندھی (شکارپور)
حضرت مولانا پروفیسر ڈاکٹر تاج افسر (اسلام آباد)
حضرت مولانا محمد ناصر عبدالعزیز (جھنگ)
حضرت مولانا قاضی محمد یوسف (حسن ابدال)
حضرت مولانا مفتی محمد انور شاہ (کوئٹہ)
محترم سید خالد ریاض بخاری (سعودی عرب)
محترم قاری محمد ایاز جدون (مانسہرہ)

مدیر اعلیٰ مفتی عبدالخالق آزاد طابع و ناشر نے اے۔ جے پرنٹرز 28/A نسبت روڈ، لاہور سے چھپوا کر دفتر ماہنامہ ''رحیمیہ'' رحیمیہ ہاؤس 33/A کوئینز روڈ، لاہور سے جاری کیا۔

www.rahimia.org